تہذیبِ مغرب کی مرمریں سِلیں

جناب منیر احمد خلیلی صاحب

تہذیب اور کلچر بہت موٹی موٹی تھیوری اور ادق نظریات اور پیچیدہ افکار سے نہیں تشکیل پاتے۔ اِن کا خمیر معاشرے کے افراد کے چھوٹے بڑے اعمال و افعال، رویّوں اور معمولات و عادات سے اُٹھتا ہے۔ کھانا پینا، اوڑھنا بچھونا، ملنا جُلنا، اُٹھنا بیٹھنا، رہنا سہنا، یہ سب اس میں شامل ہوتا ہے۔ حرکات و سکنات اِس کا جزو بنتی ہیں۔ سفر و حضر اس کی گرفت میں آتا ہے۔ جلوت ہی نہیں خلوت بھی اس کے زیرِ اثر ہوتی ہے۔ اندازِ نشست و برخاست پر اس کی چھاپ ہوتی ہے۔ تہذیب اِن سب کی مٹی گوندھ کر بنتی ہے۔ البتہ ایک چیز تہذیبی تشکیل میں بنیادی اور اہم ترین عنصر کے طور پر کارفرما ہوتی ہے۔ وہ ہیں کسی معاشرے کے مخصوص عقائد اور ایمانی تصورات۔ تمام تہذیبی اجزاء کے معانی و مفاہیم اِن اعتقادی اور ایمانی تصوّرات کے تابع ہوتے ہیں۔ تہذیب کے اجزائے ترکیبی کی اہمیّت میں کمی بیشی کا پیمانہ یہی عقائد و تصوّرات بنتے ہیں۔ مثال کے طور پر کھانے سے پہلے ہاتھ دھوتے وقت ایک غیر مُسلم کے ذہن میں محض یہ تصوّر ہوتا ہے کہ ہاتھوں کی آلودگی میں مہلک اور ضرر رساں جراثیم شامل ہو سکتے ہیں اور ہاتھ دھوئے بغیر کھانے سے وہ جراثیم معدے میں چلے جائیں گے اور کھانا کھانے والا بیمار پڑ سکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ایک خدا پرست مسلمان کھانے کی طرف ہاتھ بڑھانے سے پہلے ہاتھ دھونے کی اس لیے فکر کرے گا کیونکہ یہ سنّتِ رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم

ہے۔ ہاتھ دھونے سے صفائی اور جراثیم سے نجات کا مقصد تو حل ہو ہی جائے گا۔ اتباعِ سنّت سے خوشنودیٔ رب کا حصول بھی ممکن ہو جائے گا۔ یہاں مسلم اور غیر مسلم کے ایک ہی عمل میں غایت کے مرکزی نکتے میں بنیادی فرق سامنے آگیا ہے۔ یہی فرق دونوں کی تہذیبوں میں بھی مابہ الامتیاز کا درجہ پائے گا۔ ایک غیر مسلم کسی سے ملتے وقت صبح بخیر یا شب بخیر یا نمستے یا نمسکار کہہ کر ملے گا تو مقصد یہ ہوگا کہ اُس کی ملنساری، خوش اخلاقی اور تواضع کا ثبوت بہم پہنچ جائے۔ لیکن ایک مسلمان اپنے مسلمان بھائی کو جب سلام کرتا ہے تو اس چھوٹے لیکن بڑے ہی خوب صورت جملے کی پُشت پر حصولِ جنّت کی طلب اور ایمان کی تکمیل ہونی لازمی ہے۔ کیونکہ اس کے سامنے نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہوتا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: تم جنّت میں نہیں جا سکتے جب تک صاحبِ ایمان نہ بن جاؤ۔ اور تم مومن نہیں بن سکتے جب تک کہ تم باہم محبّت نہ کرو۔ اور کیا میں تمھیں ایک ایسی بات نہ بتاؤں جس پر عمل کرو تو تم میں باہمی محبّت پیدا ہو جائے۔ وہ عمل یہ ہے کہ آپس میں سلام کو عام کرو۔ (مسلم) باہم میل جول، محبّت بھرا تعلّق اور حسنِ معاملہ معاشرتی ضرورتوں میں سے ہے۔ کوئی معاشرہ ان اعمال اور رویّوں سے خالی نہیں۔ لیکن وہاں تعلّق داری اور محبّت و نفرت کا معیار ذاتی اغراض و مفادات ہوتے ہیں کہ بھلا ہو بھلا کا فلسفہ کارفرما ہوتا ہے۔ مسلمان معاشرے میں کسی سے بھلائی کرنے اور قریبی اور پُرمحبّت تعلّق رکھنے کی پشت پر اگر للّٰہیت کی رُوح نہ ہو تو ان اعمال، رویّوں اور تعلقات کی اہمیت خاک میں مِل جاتی ہے۔ مسلم معاشرے میں روابط و تعلقات کی اساس یہ ارشادِ نبوی بنتا ہے:

اَلْمُوَالَاۃُ فِی اللّٰہِ وَالْحُبُّ فِی اللّٰہِ وَالْبُغْضُ فِی اللّٰہِ

یعنی اللہ کے لیے دوستی، اللہ کے لیے محبّت اور اللہ کے لیے نفرت۔

عطا و نوازش سے کوئی معاشرہ عاری نہیں۔ ضرورت مند عزیزوں، پڑوسیوں اور ہم وطنوں کے لیے ایثار کیا جاتا ہے، لیکن کسی کو نوازتے وقت کہیں اپنی حاتم صفت شخصیت منوانا

مطلوب ہوتا ہے، کہیں ووٹ لینے اور کسی نوع کے تعاون کی جستجو کارفرما ہوتی ہے۔ کہیں انکم ٹیکس سے چھوٹ کے لیے خیرات کو ذریعہ بنایا جاتا ہے، کہیں تمغۂ خدمت کا حصول مقصود ہوتا ہے، لیکن اسلام نے اس عطا و نوازش کو تکمیلِ ایمان کا ذریعہ اور رب کو راضی کرنے کا راستہ بنا دیا۔ ”جو شخص اللہ کے لیے دے اور اللہ ہی کے حکم اور منشا کے مطابق دے وہ گویا اپنا ایمان مکمل کر لیتا ہے“۔ (ابوداؤد)

اِن ساری مثالوں سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ اسلامی تہذیب میں اعمال اور رویّوں کی ایجابی و سلبی قدر و قیمت کا تعین دوسری بے خدا تہذیبوں کے مقابلے میں یکسر جُدا نقطۂ نظر سے کیا جاتا ہے۔ یہاں حقیر سے حقیر عمل بڑے بڑے مثبت یا منفی نتائج کا حامل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اپنے پیروکاروں کو یہ ہدایت دی ہے کہ نہ تو کسی نیکی کو حقیر جانو خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی ہو، نہ ہی کسی بُرائی کو معمولی سمجھو خواہ درجے میں وہ صغائر کی فہرست میں سب سے نیچے ہو۔ قرآنِ پاک میں ہے:

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (زلزال-۸)

یعنی ذرہ برابر نیکی اور ذرہ برابر بدی یومِ حساب نظر انداز نہیں رہے گی، سب انسان کے سامنے آجائے گی۔ یہاں تک کہ بعض اعمال انسان سے سرزد ہوتے ہیں تو وہ اس کی نظر میں اتنی اہمیت کے قابل بھی نہیں ہوتے کہ اگلے لمحے تک انہیں ذہن میں رکھے۔ قیامت کے روز وہ اپنے حساب میں یہ باریک شماری دیکھ کر حیران رہ جائے گا کہ اُس کے نامۂ اعمال میں ایسی نیکیاں اور ایسے گناہ محفوظ ہیں جنہیں خود اُس نے دُنیا میں پرِکاہ اہمیت نہیں دی تھی۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اسی بنا پر اپنے اعمال پر خود کڑے محاسب اور تُرش رُو داروغہ کی مانند خوردہ گیر رہتے تھے۔ یومِ حساب کے ڈر سے اپنے اعمال کا خود حساب کتاب کرتے رہتے تھے۔ اور اپنے نمبر لگاتے وقت انتہائی سخت ممتحن کا

انداز اختیار کرتے تھے۔ ہم آج جن باتوں اور حرکتوں کو معمولی جان کر بے دھڑک زبان اور ہاتھ پاؤں سے صادر کر دیتے ہیں، وہ اس طرح کی باتوں کو زبان سے نکالنے اور ایسے رویّے کے تصور سے کانپ اُٹھتے تھے، چنانچہ حضرت انسؓ بتاتے ہیں اور یہ بخاری کی روایت ہے:

"تم لوگ بہت سے اعمال ایسے کرتے ہو کہ تمہارے نزدیک وہ بال سے بھی زیادہ باریک اور ہلکے ہیں، ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دَور میں ان کو مہلکات (تباہ کر دینے والے اعمال) میں شمار کرتے تھے۔"

آئندہ سطور میں ہم چند ایسی چیزوں کا مختصراً ذکر کرتے ہیں جو بظاہر معمولی نظر آتی ہیں۔ ان کے ترک و اختیار کے وقت انسان کے احساس کو کوئی سخت جھٹکا نہیں لگتا۔ بعض کے بارے میں ہلکی سی چبھن بھی نہیں ہوتی، لیکن ان سب کا ہمارے اعتقادات اور ہماری تہذیبی روایات کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ جب ایک سنّت ہاتھ سے چھوٹتی اور عمل سے خارج ہوتی ہے تو اُس کی جگہ خالی نہیں رہتی، بلکہ کوئی بدعت اُس خلا کو پُر کر دیتی ہے۔ ہم اپنی معاشرت کی پہچان رکھنے والے کسی عمل کو ترک کرتے ہیں تو مغربی یا ہندوانہ تہذیب کی کوئی رسم یا روایت ہمارے تہذیبی تسلسل میں داخل ہو جاتی ہے:

ا۔ دوپٹہ بظاہر دو گز کپڑا ہے، لیکن یہ ہماری تہذیب میں عقیدے کی قوّت سے داخل ہو کر عورت کی نسوانیت، وقار، شرف و عزّت، شرم و حیا، نیکی و شرافت اور خاندانی عظمت پر دلالت کرتا ہے۔ چہرہ نہیں تو کم از کم سر ہی اچھی طرح ڈھانپ کر رکھنے والی عورت کے بارے میں اوّلین تاثر اُس تاثر سے بالکل مختلف ہوتا ہے جو کسی بے حجاب اور ننگے سر والی عورت کو دیکھ کر اُبھرتا ہے۔ دوپٹہ کھو جائے تو نسوانیت گم ہونے لگتی ہے۔ یہ ایک ایسی اینٹ ہے جو دیگر بہت سی اینٹوں کے لیے سہارا بنتی ہے۔ یہ اپنی جگہ سے کھسک جائے تو آہستہ آہستہ وہ ساری اینٹیں بکھرنے لگتی ہیں، جن کے لیے یہ پہلی اینٹ سہارے کا کام دے رہی تھی۔ اولاد کی تربیت، دینی اقدار کا احترام، خوفِ خدا، پاسِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم، فکرِ آخرت، ازدواجی

ڈھانچے اور خاندانی تعلقات، غرض سب پر اثرات پڑتے ہیں اور ایک کنبے اور خاندان کی شناخت کے پیمانے بدل جاتے ہیں۔

۲۔ لیٹرین اور غسل خانہ کی یک جائی بظاہر بہت چھوٹی سی بات ہے۔ اس میں کئی فائدے بھی مضمر ہیں۔ بچت اور کفایت کا ذریعہ ہے۔ کم محنت اور کم جگہ میں ضرورت پوری ہوسکتی ہے، لیکن اسلامی کلچر میں غسل خانہ اپنا ایک جُدا تصور رکھتا ہے، جس کے ساتھ پاخانے کو جمع نہیں کیا جا سکتا، لیکن آج کل یہ رواج چل نکلا ہے کہ غسل خانہ اور لیٹرین ایک ہی کمرے میں ساتھ ساتھ بنتے ہیں۔ بہت سے انتہائی دیندار گھرانوں میں بھی اس رواج کو اپنا لیا گیا ہے۔ پھر لیٹرین میں رفع حاجت کے لیے بنی ہوئی مخصوص جگہ کا رُخ اگر اس طرح ہو کہ بیٹھتے ہوئے رُخ یا پیٹھ کعبہ شریف کی طرف ہو رہی ہو تو اس چھوٹی سی بات کا خیال نہ رکھنے سے نہ معلوم کتنے دینی احساسات مُردہ ہو جاتے ہیں۔ بے حسی کی یہ کیفیت اگر گہری ہونے لگے اور بعض بُرائیوں کو معمولی سمجھ کر قبول کرنے کی روش چل پڑے تو انسان کا نفس اُسے بڑی بُرائیوں پر اُبھارنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

۳۔ مردانہ پتلون بظاہر ایسا لباس ہے جسے آج بڑی حد تک باوقار، شائستہ، پُر رعب اور اعلیٰ و جدید تعلیم یافتگی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ ہم اس کے غیر اسلامی ہونے پر نہ خود اصرار کرتے ہیں، نہ اس پر کسی کو قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شرفا اور بڑے بڑے سکالر اور صاحبانِ علم بھی پتلون پہن رہے ہیں، تاہم ایک پہلو بہر حال ناقابلِ انکار ہے کہ پتلون کی ساخت اور تراش خراش سے مغرب کے تہذیبی رویّوں کا گہرا تعلّق ہے۔ وہاں کھڑے کھڑے پیشاب کرنا قطعاً معیوب نہیں ہے۔ پتلون پوش عموماً پیشاب کے دوران میں وہ سہولت نہیں رکھتے جو دھوتی لنگوٹے یا شلوار پہننے والوں کو میسّر ہوتی ہے، چنانچہ پتلون کے کلچر کی مناسبت سے ہر کہیں پتلون پوشوں کے لیے یہ رعایت رکھی جاتی ہے کہ انہیں پیشاب کرنے میں دِقّت نہ ہو۔ ہوٹلوں، کلبوں، ہوائی اڈوں، بس سٹاپوں، ریلوے اسٹیشنوں، سرکاری دفتروں

ہیں جو حمام بنے ہوتے ہیں وہاں پتلون پہننے والوں کے لیے دیواروں کے ساتھ ایسے پاٹ لگے ہوتے ہیں جہاں وہ کھڑے کھڑے آسانی سے پیشاب کر سکیں۔ کھڑے ہو کر پیشاب کرنے میں کتنی قباحتیں ہیں یہ شائستگی کے منافی ہے، غیر سنجیدہ حرکت ہے۔ اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔ طہارت اور پاکیزگی برقرار رکھنے میں مانع ہے۔ لیکن جو لوگ محض لباس کی مجبوری کے باعث اس قبیح انداز کو اختیار کرتے ہیں، وہ آہستہ آہستہ اسے عادت بنا لیتے ہیں۔ ایسی عادات تہذیبِ اغیار کا تابع بنا کر انہیں اپنی دینی تعلیمات اور روایات سے کاٹ دیتی ہیں۔

۴۔ فرشی دستر خوانوں کی روایت مٹتے مٹتے اب بالکل ختم ہو گئی ہے۔ اِس کی جگہ ڈائننگ ٹیبل نے لے لی ہے۔ اب تکلّفات بڑھے، دعوتوں میں شرکا کی تعداد اور انداز بدلے۔ مہمانوں کو بٹھا کر کھلانا مشکل سے زیادہ جاہلانہ عمل نظر آنے لگا۔ اب دعوتیں خواہ کسی نوعیّت کی بھی ہوں اُن میں بڑی مضحکہ خیز سی صورت پیدا ہوتی ہے۔ کھڑے ہو کر کھانا مجبوری اور فیشن بن گیا ہے۔ میزبان مہمانوں کی بڑی تعداد کو ترتیب سے بٹھا کر ایک ایک کے آگے پلیٹ رکھنے اور ایک ایک کو کھانا پہنچانے کے جھنجھٹ سے چھوٹ گئے۔ بس ایک جگہ پلیٹیں ڈھیر کر دیں، سٹینڈوں پر رکھی بالٹیوں میں سالن، چاول ڈال دیئے۔ جس کی ہمّت ہے جو چاہے جھپٹ کر اُٹھا لے۔ جو بڑھ کر تھام لے مینا اُسی کا ہے، والی بات۔ ایک رُخ پر روسٹ مُرغیاں ادھ چبی لنگی جا رہی ہوتی ہیں اور دوسری طرف کچھ محتاط دست شرفا شڑپ شڑپ شور با پی کر ہی اپنے آپ کو کوس رہے ہوتے ہیں۔" مل کر کھاؤ، اپنے سامنے سے کھاؤ، چبا چبا کر کھاؤ، کھانے میں دوسروں کا خیال رکھو، جو اپنے لیے پسند کرو، وہی دوسروں کے لیے بھی پسند کرو، جیسی تعلیمات کی مٹی جتنی اِن دعوتوں میں پلید ہوتی ہے، شاید ہی کہیں اور ہوتی ہو۔ اِن دعوتوں کے مواقع پر آج کل خلافِ سنّت اطوار مجموعی طور پر بہت زیادہ اختیار کیے جاتے ہیں۔ تکلفات، نمود و نمائش، فیشن زدگی اور دیکھا دیکھی عمل جمع ہو کر ایسی فضا پیدا کرتے ہیں کہ جو لوگ مسنون اور معقول طریقے سے

ان دعوتوں میں کھانے پینے کے خواہش مند ہوتے بھی ہیں وہ مجبوراً اپنی تہذیب اور اپنے دین کی روایات سے متضاد ماحول میں ایسا کر نہیں پاتے۔

۵۔ جلدی سونا اور جلدی جاگنا سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلّم ہے۔ یہ صحت کے لیے مفید اور فطرت کے قریب عمل ہے۔ انسان کی طبیعت خوش باش اور قوتِ کار بحال رہتی ہے۔ مزاج خوش گوار رہتا ہے۔ راتوں کو جاگنا اور دیر تک جاگنا کسی دور میں لوفر لفنگوں، چور اُچکوں، درندوں اور موذی جانوروں کا معمول سمجھا جاتا تھا، لیکن آہستہ آہستہ مغربی طور اطوار کا رنگ ہم پر چڑھنے لگا۔ اہلِ مغرب ہوٹلوں، کلبوں اور شراب خانوں میں دادِ عیش و طرب دینے اور لہو و لعب میں ڈوبے رہنے کے لیے رات کے پہلے پہروں ہی کو استعمال کرتے ہیں۔ صبح دیر تک سونا ایسے لوگوں کی مجبوری اور پھر عادت ہو جاتی ہے۔ ہمارے ہاں ٹیلیویژن کی آمد نے شب بیداری کا سامان پیدا کیا۔ اب بہت کم گھرانے ایسے ہیں جہاں دیر تک جاگنا اور دیر سے جاگنا معمول نہ ہو۔ گویا اس پہلو سے بھی ہم نے فرنگی تہذیب سے مطابقت پیدا کر لی ہے۔

۶۔ کرکٹ کا کھیل ہماری قوم کا جنون اور دیوانگی کی حد تک بڑھا ہوا شوق بن گیا ہے۔ اس وائرس نے پھیل کر قوم کی تمام رگوں میں اپنا زہر پھیلا دیا ہے۔ اس پر تفصیل سے اور بہت زیادہ لکھنے کی ضرورت ہے۔ یہاں ہم اختصاراً چند پہلوؤں کی نشاندہی پر اکتفا کریں گے۔ یہ کھیل بنیادی طور پر تمام کا تمام ہمارے تہذیبی رویّوں سے متصادم ہے۔ اس کے اندر وہ مارشل سپرٹ نہیں ہے جو بعض کھیلوں کا خاصا ہے۔ تضیعِ اوقات، سہل انگاری، بے فکری، مہنگا پن اس کھیل کی بنیادی خصوصیات میں سے ہیں۔ قوم کو کچھ نہ دے کر یہ قوم کے اندر سے قوتِ کار، عاقبت و انجام اندیشی اور محنت و جفاکشی کے جذبے سلب کر رہا ہے۔ مزاج کے اعتبار سے اس کی مناسبتوں کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ فلمی اداکاراؤں اور کرکٹروں میں کوئی ایسی خفیہ قدر مشترک ہے کہ ہمارے بعض کرکٹروں کی شادیاں فلمی ایکٹریسوں سے ہو چکی ہیں۔ کئی ایک کے باہمی ناپسندیدہ روابط کے قصّے اخبارات کی زینت

بنتے رہتے ہیں۔ کرکٹ کو آج عمدہ ذوق کی علامت سمجھ لیا گیا ہے۔ حالیہ ایک روزہ میچوں کے دوران میں ایک مقام پر ایک خاندان کے بہت سے افراد جمع تھے۔ دیندار گھرانہ پردہ دار دوشیزائیں، لیکن کرکٹ کی بیماری کا اثر اُن پر بھی دیکھا۔ ایک محترمہ پوچھتی ہیں: "آج کے میچ کا کیا بنا؟" سب نے کچھ تاسف بھرے لہجے میں بتایا کہ وہ خبریں نہیں سُن سکے۔ اس پر اُن دیندار اور برقعہ پوش اور طالبات کی ایک دینی تنظیم سے وابستہ طالبہ نے تبصرہ فرمایا "کیا تم سب اتنے بے ذوق ہو کہ کسی کو میچ کے رزلٹ کی کوئی خبر نہیں"! اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کرکٹ کا روگ کیسی کیسی رگوں میں سرایت کر گیا ہے۔

ایک اور قابلِ توجہ پہلو یہ ہے کہ ملّتِ اسلامیہ کے بڑے دشمن اور بدخواہ ممالک میں سے کرکٹ کا کھیل روس میں ہے نہ امریکہ میں اور نہ اسرائیل میں۔ یہ انگریزوں کی عنایت ہم ذہنی غلاموں پر ہوئی اور ہم نے بڑی ممنونیت سے اس عنایت کو اپنی تہذیبی روایت بنا لیا ہے۔